اسلامی ریاست عصر حاضر میں

(۳)

محمود احمد غازی

اسلامی نظام سیاست میں جماعتوں کا وجود

اسلام میں سیاسی جماعتوں کے وجود اور عدم وجود پر گزشتہ چند سالوں میں بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے۔ بعض اہل علم نے مغربی انداز کی سیاسی جماعتوں کے وجود کو ایک جدید اسلامی ریاست کے قیام اور اس کی کامیابی اور عمدہ کارکردگی کے لئے ناگزیر قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس بعض دوسرے اہل علم نے ہر اس اجتماعی اور منظم کوشش کو خلاف شریعت قرار دیا ہے جس کا مقصد سیاسی اصلاح، سیاسی کام یا کسی دینی مقصد کے لئے حصول اقتدار ہو۔ ہماری ذاتی رائے میں اس طرح کے عمومی بیانات دینا درست نہیں، بلکہ راہ راست ان دونوں انتہاؤں کے درمیان معلوم ہوتی ہے۔

یہ تو امر واقعہ ہے کہ جدید دور میں ریاستی نظم ونسق اور حکومتوں کی تشکیل کے معاملات خاصے پیچیدہ اور نازک ہو گئے ہیں۔ معاشرہ بھی صدر اسلام کی طرح سادہ اور پاکیزہ نہیں رہا، اختیار و اقتدار کو امانت الٰہی سمجھ کر شریعت خداوندی کی حدود کے اندر رہ کر استعمال کرنے کا جذبہ بھی قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ ایسی صورت حال میں ریاستی نظم ونسق کے ان سادہ اور ابتدائی طور طریقوں کو جوں کا توں اپنا لینا نہ تو خود شریعت الٰہی کی منشاء ہے اور نہ اس سے دینی مقاصد کو کوئی معتد بہ فائدہ پہنچ سکتا ہے، بلکہ مآل کار نقصان ہی پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

اس صورت حال میں صحیح اسلامی رویہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم غیر جانبداری کے ساتھ اپنے موجودہ حالات کا جائزہ لے کر ان کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بدلنے کی کوشش کریں اور مقاصد شریعت کو پورا کرنے میں اس زمانہ کے وسائل، سہولتوں، تجربات اور ایجادات سے بھرپور استفادہ کرنے میں ذرہ برابر تأمل نہ کریں۔

موجودہ زمانے کی نمائندہ حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کا آپس میں گہرا اور قریبی تعلق ہے ۔ مغربی جمہوریت کی رو سے تو ان دونوں کو آپس میں لازم و ملزوم ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مفکرین ایک اسلامی حکومت کے قیام کے لئے بھی مغربی انداز کی سیاسی جماعتوں کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن سیاسی جماعتوں کے جواز اور عدم جواز پر گفتگو کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ طے کرلیں کہ ہماری اس گفتگو میں ایک سیاسی جماعت سے کیا مراد ہے ؟ ہم اپنی اس بحث کے سیاق و سباق میں سیاسی جماعت کی تعریف یوں کر سکتے ہیں :

" شہریوں کی ایک جماعت جو اپنے یکساں سیاسی خیالات کی ترویج یا مشترکہ سیاسی مقاصد کے حصول اور پروگرام کی تکمیل کے لئے مل جل کر کام کرتی ہے۔"

بلاشبہ اس مفہوم کے لحاظ سے اسلامی سیاست میں سیاسی جماعتیں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد انصار، حضرت سعد بن عبادہؓ کی قیادت میں اور مہاجرین حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی قیادت میں دو ممیز اور جداگانہ سیاسی رائے رکھنے والے دو گروہوں کی صورت میں سامنے آئے اور اس حیثیت میں سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے۔ یہ دونوں گروہ دو مختلف سیاسی رائے رکھتے تھے اور دونوں گروہوں کے رہنماؤں نے وہاں موجود لوگوں کے سامنے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ دونوں نقطہ ہائے نظر کے علمبردار اصحاب کی خواہش تھی کہ وہاں موجود حاضرین ان کی رائے سے اتفاق کرلیں۔ بنو ہاشم پر مشتمل ایک تیسرا سیاسی

نقطۂ نظر جس کی نمائندگی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کر رہے تھے۔ اس وقت وہاں پیش نہیں کیا جا سکا ان حضرات نے بعد میں اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ ان کے قائد سے مشورہ کئے بغیر خلافت کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ بعد کے ادوار میں خارجی از حد منظم بلکہ بعض اوقات جنگ جو گروہوں کی صورت میں نمودار ہوئے لیکن محض ان کے جداگانہ سیاسی نظریات اور علیحدہ سیاسی تنظیموں کے باعث انہیں کبھی دبایا نہیں گیا۔ ان سے صرف اس وقت جنگ کی جاتی جب وہ ہتھیار اٹھاتے۔ حضرت علیؓ نے انہیں واضح طور پر بتا دیا تھا کہ جب تک وہ پرامن رہیں گے اور متشددانہ کارروائیوں سے گریز کریں گے انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ تاریخ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خارجیوں کا مسئلہ حل کرنے کے لئے انہیں مذاکرات اور دیگر پرامن اور سیاسی ذرائع سے قائل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح بنو امیہ اور بنو ہاشم کے حامی بھی دو منظم اور متحارب سیاسی جماعتوں کی صورت میں تقریباً ایک سو سال تک سرگرم عمل رہے۔ وہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی رہے۔ ان میں سے ایک گروہ نے اپنے رہنما محمد بن عبداللہ بن حسن کے زیر قیادت جنہیں عموماً النفس الذکیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، عباسیوں کے ابتدائی دور میں حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ اور امام مالک بھی اس تحریک کے حامیوں میں سے ایک تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بڑے پرجوش انداز میں نفس ذکیہ کے موقف کی وکالت کی ہے"[1]۔

موجودہ سیاسی پارٹیوں کے متوازی و مماثل ان تاریخی گروہوں کے علاوہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا شریعت کی رو سے سیاسی اختلاف رائے کی اجازت ہے۔ کیا اس امر کی اجازت ہے کہ کچھ لوگ مشترک اور جائز سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے مل جل کر کام کریں اور جماعتیں، گروہ اور انجمنیں قائم کریں، جہاں تک مخلصانہ اور معقول اختلاف رائے کا تعلق ہے اس میں قطعاً کوئی شبہہ نہیں کہ شریعت نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت دیتی ہے بلکہ اسے باعث خیر و برکت سمجھتی ہے۔

(اختلاف امتی رحمۃ) دور صحابہؓ سے لے کر اب تک امت میں باہمی اختلاف رائے کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ اور ایسی مثالیں بھی بے شمار ہیں کہ مشترکہ نصب العین کے حصول کے لئے مل جل کر اجتماعی کوششیں بروئے کار لائی گئیں۔ کسی مشترکہ مقصد کے لئے کوئی جماعت بنانا یا معاشرتی انصاف اور مساوات قائم کرنے کے لئے مل جل کر کوشش کرنا یقیناً ایک قابل تعریف بات ہے۔ حلف الفضول جس میں خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصہ لیا[۱] ایسی اجتماعی اور منظم کوشش کی پہلی اور نمایاں مثال ہے۔

مزید برآں آزادی فکر اور آزادی اظہار رائے کا یہ تقاضا ہے کہ اس امر کی ضمانت ملنی چاہیئے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر ان آزادیوں کو بروئے کار لانے کی اجازت ہو گی۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بجا لائیں[۲]۔ ایک دوسرے کو سچائی اور صبر کی تلقین کریں[۳] اور ایک دوسرے کو فسق و فجور سے روکیں[۴]۔ کیا شریعت ان فرائض کو منظم اور اجتماعی انداز میں بجا لانے سے روکتی ہے؟

کسی جابر حکمران پر تنقید کرنے اور اس کے روبرو کلمہ حق کہنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین جہاد قرار دیا ہے (ترمذی) کیا یہ جہاد صرف انفرادی سطح پر اور غیر منظم انداز میں کیا جانا چاہیئے؟

خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے افتتاحی تقریر کی تو امت سے فرمایا۔

"اگر میں صحیح کام کروں تو میرے ساتھ تعاون کرو اور اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔"[۵]

تعاون کے سلسلے میں تو یہ ممکن ہے کہ افراد اپنی انفرادی حیثیت میں تعاون کریں لیکن کسی غلط کار حکمران کو سیدھا کرنا اجتماعی کوششوں کے بغیر کم از کم بعض صورتوں میں تو ہر گز ممکن نہیں۔ اس مقصد کے لئے تمام جائز ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے عام جلسوں کا انعقاد، رسائل کی اشاعت، رائے عامہ کو متحرک کرنا اور ایسے ہی دیگر ذرائع سے کام لیا

جانا چاہیئے۔ بلکہ امام غزالی کے استاد امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک الجوینی (متوفی ۴۷۸ھ) نے تو ایک غلط کار حکمران کو نکال باہر کرنے کے لئے تلوار اٹھا لینے اور تحریک چلانے کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔[۹] اندلس کے ایک مفسر ابن عطیہ نے ایسے حکمرانوں کو جو شوریٰ سے بالا بالا معاملات کو طے کر دینے کے عادی ہوں معزول کر دینے کو فرض قرار دیا ہے۔[۱۰]

لیکن اس سلسلہ میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قبل ایک مسئلہ کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ آج کل کے جدید دور میں جس قسم کی سیاسی پارٹیاں پائی جاتی ہیں کیا اسلام کے سیاسی اور اخلاقی نظام میں اس قسم کی پارٹیوں کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ کیا امت مسلمہ کا قرآنی تصور اس کی اجازت دیتا ہے کہ مسلمانوں میں مستقلاً ایسے گروہ موجود رہیں جن کا مقصد وجود ہی محض حصول اقتدار ہو جو کرسی کی خاطر ایک دوسرے کی نہ صرف عزت و آبرو بلکہ جان تک کے درپے رہیں؟ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں صرف کسی سیاسی تنظیم کا قیام ہرگز نقصان دہ نہیں۔ اگر نقائص اور خامیوں سے پاک کوئی ایسا غیر جانبدار اور قابل اعتماد نظم قائم کر دیا جائے جو سیاسی جماعتوں پر چند ایسی مناسب اور معقول قیود عائد کر دے جن سے ان کی سرگرمیوں کا رخ اسلام کی طرف موڑا جا سکے اور اس امر کی ضمانت حاصل ہو کہ سیاسی پارٹیاں ملک میں فرقہ بندیاں پیدا کرنے کے بجائے اسلامی تعلیمات کے مطابق صحیح سیاسی عمل کی نشو و نما کے لئے کام کریں گی تو اس صورت میں ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ اپنی تاریخی روایات اور جدید سیاسی تجربات کے درمیان ایک خوبصورت ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔

ان پابندیوں میں یہ بات بھی شامل ہونی چاہیئے کہ شوریٰ یا اہل حل و عقد حکمران پارٹی اور حزب اختلاف میں تقسیم نہ ہوں۔ اگر امیر یا حکومت صحیح کام کرے تو شوریٰ کے ہر رکن اور ہر شہری کو اس کی حمایت کرنی چاہیئے لیکن اگر وہ غلط کام کرے تو ہر شخص کو حزب اختلاف کا کردار ادا کرنا چاہیئے اور ڈٹ کر اس کے غلط اقدامات کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ اگر کسی مسئلے میں واقعی اختلاف

رائے پیدا ہو جائے کہ فلاں اقدام مصلحت وقت کی رو سے صحیح ہے یا غلط تو اکثریتی فیصلے کا احترام کرتے ہوئے اس پر عمل ہونا چاہیئے۔ تنقید برائے تنقید اسلامی اخلاق کے خلاف ہے۔ کچھ اور اصلاحات بھی نافذ کی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر بعض مغربی ممالک میں رائج بازطلبی (RECALL) کا نظام ہمارے ہاں بھی جاری کیا جاسکتا ہے تاکہ پارلیمینٹ کے ارکان کو ان کے اصل موقف پر قائم اور مستقیم رکھا جاسکے۔

آخری بات یہ کہ امت کبھی برائی پر متفق نہیں ہوسکتی۔ اب امت مسلمہ عملاً سیاسی پارٹیوں کے وجود کو ایک امر جائز یا کم از کم عموم بلوی کے طور پر قبول کر چکی ہے۔ ہمارے ہاں تقریباً گزشتہ ۵۰ سال سے جدید طرز انتخابات رائج ہیں۔ اگرچہ اس نظام انتخاب میں اصلاح کے لئے آوازیں اٹھتی رہی ہیں لیکن کسی قابل ذکر سیاسی مفکر نے اسے بالکلیہ رد نہیں کیا۔ مسلم الثبوت اور مستند علمائے کرام اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے نمایاں رہنما بلاواسطہ یا بالواسطہ ایک ایسے نظام کے تحت انتخابات میں حصہ لیتے رہے ہیں جو ہمیشہ سیاسی پارٹیوں پر مبنی رہا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، شیخ حسن البنا۔ سید رشید رضا۔ سید قطب استاذ مصطفیٰ احمد الزرقاء۔ ڈاکٹر محمد ناصر استاذ علال الفاسی۔ مولانا مودودی اور بہت سے دیگر بڑے بڑے اور نامور اہل علم کے نام بطور مثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ تازہ ترین مثال ایران کے آیت اللہ العظمیٰ خمینی اور آیت اللہ العظمیٰ شریعت مداری وغیرہ کی ہے جو اہل تشیع کے لئے دینی و علمی مرجع اعلیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک اقتباس پیش کرنا مفید ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں۔

"اسلام میں خلافت و امارت کا استحقاق اس پارٹی کو حاصل ہوتا ہے جس کو اپنی دینی و اسلامی خدمات اور اپنے سیاسی اثر و رسوخ کے اعتبار سے ملک کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔"

کیا بالغ رائے دہندگی کے اصول کی اجازت ہے۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہو گی کہ اسلام میں نہ صرف یہ کہ بالغ رائے دہی کے اصول کی اجازت ہے بلکہ آج کے دور میں ایک صحیح، پائیدار اور مستحکم اسلامی حکومت کے قیام اور بقاء کے لئے بالغ رائے دہی کا اصول ایک ناگزیر حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ماضی میں جن اسباب (وسائل حمل و نقل کی کمی اور سست رفتاری وغیرہ) کے پیش نظر امت کے ارباب علم و فکر نے بالواسطہ انتخاب کا طریقہ کار اختیار کیا تھا وہ اسباب کم از کم پاکستان میں موجود نہیں ہیں۔ لہذا اس فقہی قاعدہ کے موجب کہ جب سبب زائل ہو جائے تو مسبب بھی زائل ہو جاتا ہے آج کے دور میں پاکستان جیسے اچھے خاصے ترقی یافتہ ملک میں بالغ رائے دہی سے انکار نہ شرعاً درست معلوم ہوتا ہے اور نہ مصلحتہً ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ پوری امت مسلمہ بحیثیت مجموعی خلافۃ اللہ کی حامل ہے اور خلافت الٰہیہ کے اس منصب میں ہر مسلمان یکساں طور پر شریک ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی خلافت ارضی اور تمکن فی الارض کا ذکر ہے وہاں بحیثیت مجموعی تمام اہل ایمان سے خطاب ہے، مثال کے طور پر سورۂ حج کی مشہور آیت تمکین[9] میں روئے سخن تمام مومنین و مومنات کی طرف ہے۔ یہی حال دوسری بہت سی آیات کا ہے کہ قطع ید سے لے کر جلد مأۃ تک تمام احکام کے مخاطب تمام اہل اسلام ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی رو سے خلافت الٰہیہ کا منصب ساری امت کو یکساں طور پر حاصل ہے۔ اس لئے ان تمام خلفاء کو جو قانوناً اس امر کے اہل ہوں کہ اپنے دیوانی معاملات خود طے کر سکیں۔ اپنے یہ معاملات طے کرنے کا یکساں حق حاصل ہونا چاہیئے اور ادارۂ خلافت کی انتظامی مشینری کے قیام میں ان سب کا یکساں حصہ ہونا چاہیئے۔

چونکہ امامت (اسلامی حکومت) عبارت ہے اس معاہدۂ وکالت سے جو امت اور امام کے درمیان قائم ہوتا ہے لہذا امت کا ہر رکن اگر وہ معاہدہ کرنے کا اہل ہے وکالت کے اس معاہدے پر دستخط کرنے یا اسے رد کرنے کا حق رکھتا ہے۔ مزید برآں قرآن مجید کی وہ تمام آیات اور احادیث جن میں

اسلامی ریاست کے قیام کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کا خطاب یکساں طور پر تمام اہل مسلمانوں سے ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لوگوں کا ایک طبقہ دوسروں کو محروم کر کے اس پر اجارہ داری قائم کر لے۔

قرآن مجید کا اعلان ہے کہ تمام مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ہر بھائی کو حق حاصل ہے کہ وہ دیکھے آیا ان کی مشترکہ جائیداد کا انتظام و انصرام مناسب طریقے سے ہو رہا ہے یا نہیں اور یہ کہ ان کے مشترکہ معاملات کو چلانے کے لئے جن لوگوں کو وکیل بنایا جا رہا ہے وہ قابل اعتماد اور اہل ہیں یا نہیں۔ کیا دنیا کے کسی قانون کی رو سے کسی بھائی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ دوسرے بھائیوں کو اس حق سے اس بنا پر محروم کر دے کہ وہ علم صحت یا دولت میں اس سے کم تر ہیں؟

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب کی مثال بالغ رائے دہی کی واضح ترین مثال ہے اس کی تفصیلات تو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ ہاں اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اس موقع پر چیف الیکشن کمشنر حضرت عبدالرحمان بن عوف نے عام لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے جو محنت اور مشقت کی اس کی تفصیلات مشہور مورخ اور مفسر علامہ ابن کثیر نے بیان کی ہیں۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف نے مسلسل تین شب و روز تک اپنے آپ کو اس کام میں مصروف رکھا اور مدینہ شہر کے علاوہ اس کے قرب و جوار میں جہاں جہاں جانا ان کے لئے اس محدود وقت میں ممکن تھا گئے اور لوگوں کی رائے معلوم کی وہ اساتذہ سے ملے، علماء اور طالب علموں سے ملے، تاجروں، راستہ چلنے والوں، باہر سے آنے والوں، مردوں، عورتوں اور نوعمر لڑکوں سے ملے یہاں تک کہ وہ خواتین کی خلوت گاہوں میں بھی گئے تاکہ ان سے مشورہ کریں اور ان کی رائے سے آگاہ ہوں۔ ان سب معلومات اور رائے عامہ کے ہمہ گیر سروے کے مطابق وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ چند ایک کے علاوہ مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت حضرت عثمانؓ کے حق میں ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمانؓ نے ان کے خلیفہ منتخب ہو جانے کا اعلان کر دیا۔[۱۰]

کیا اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرنے کی اجازت ہے۔

اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرنے کا مسئلہ ان دنوں بڑے نزاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسلامی سیاست میں کسی سرکاری عہدے کے لئے خود اپنی خدمات پیش کرنا یکسر ممنوع ہے۔ شاید اس نزاع کے پیدا ہونے کے اسباب وہ ہولناک نتائج ہیں جو کہ موجودہ دور کے انتخابی نظام سے ظاہر ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی احادیث بھی ہیں جن میں سرکاری خصوصاً عدالتی عہدوں کے حصول کی کوشش کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ احادیث تمام محدثین بشمول بخاری مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ امام احمد وغیرہم نے روایت کی ہیں۔ ان احادیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو اس بنیاد پر سرکاری مناصب دینے سے انکار فرما دیا تھا کہ انہوں نے خود ان کے حصول کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس موضوع سے متعلق جو فقہی اور حدیثی لٹریچر موجود ہے اگر اس کا دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ خود امیدواری صرف اس شخص کے لئے ممنوع ہے جو اس عہدے کے لئے نااہل ہو۔ صرف دنیاوی فائدے کے لئے عہدہ حاصل کرنا چاہتا ہو۔ اسے حاصل کرنے کے لئے رشوت دے یا صرف اس مادی زندگی میں بلند مقام حاصل کرنے سے دلچسپی رکھتا ہو۔ اس سلسلہ میں فقہاء اور محدثین ومفسرین نے جو بحثیں کی ہیں ان کی رو سے خود امیدواروں کی مختلف صورتیں ہیں اور ان کے مختلف احکام ہیں۔ بعض صورتوں میں ایسی کوشش کو صرف ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض دوسرے مواقع پر انسان کے لئے واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرے۔ تاہم کچھ اور مواقع پر خود کو بطور امیدوار پیش کرنا ناپسندیدہ سمجھا جائے گا، اور بہت سے دیگر مواقع پر اس کی محض اجازت ہو گی۔ یہ بہت مشکل ہے کہ یہاں ان تمام ممکنہ صورتوں پر تفصیلی بحث کی جائے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں ناپید نہیں ہیں کہ لوگوں نے اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کیا ہو۔ انتخاب خلیفہ کے لئے حضرت عمر فاروق رضؓ کی مقرر کردہ کمیٹی نے امیدواروں کی طرف

سے اپنے اپنے نام واپس لئے جانے کا جو طریقہ تجویز کیا تھا حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اس کے مطابق اپنا اپنا نام واپس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا یہ انکار خود امیدواری ہی کی ایک صورت تھی۔ اور اس سے پہلے انصار مدینہ کا اس مطالبے پر اصرار بھی کہ امیر کا انتخاب انہی میں سے ہونا چاہیے مسئلہ زیر بحث سے خاصی قوی مشابہت رکھتا ہے۔ مزید برآں حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوتے وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا یہ شرط منوانا کہ اول الذکر کی وفات کے بعد خلافت انہیں کو ملے گی خود امیدواری کی شاید واضح ترین مثال ہے۔ اسی طرح خود حضرت امیر معاویہ کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ گزشتہ ۱۳۶۰ سال میں ان کی ذات کو کبھی نہ ختم ہونے والی تنقید کا نشانہ بنائے جانے کے باوجود کسی نے آج تک انہیں محض اس بنیاد پر طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنایا کہ وہ خود اپنی کوشش سے خلیفہ بنے۔ ہم اس سے پہلے النفس الذکیہ کی مثال پیش کر چکے ہیں۔ جنہوں نے اپنی ذات کے لئے خلیفہ کا منصب حاصل کرنے کے لئے پر زور کوشش کی اور اس غرض سے مسلح جدوجہد بھی کی اور کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ نے بھی ان کی تحریک کا ساتھ دیا تھا۔

تاہم اسلام ہر کس و ناکس کو اس بات کی کھلی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس بہانے سے امت مسلمہ میں انتشار و افتراق اور افراتفری پیدا کرے۔ اس سلسلے میں شریعت کی طرف سے جو رعایت دی گئی ہے وہ کچھ حدود و قیود کے ساتھ مشروط ہے۔ کسی نہ کسی طرح عوام کو بیوقوف بنا کر ان کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور اس کے لئے بھاری اخراجات برداشت کرنا اور عوامی سطح پر نفرت انگیز مہمیں چلانا اور ان کے نتیجہ میں امت مسلمہ کے درمیان محاذ آرائی اور افتراق و تشتت کو جنم دینا شریعت میں کسی طرح بھی جائز قرار نہیں پا سکتا۔ اگر کچھ لوگ شریعت کی اس اجازت کو غلط استعمال کر رہے ہوں اور ان کے اس غلط استعمال کے برے نتائج نکل رہے ہوں تو امت کے ارباب حل و عقد کا یہ فرض ہے کہ وہ شریعت کے اصول سد الذرائع کے تحت اس اجازت پر مناسب پابندیاں

اور ضروری حدود و قیود عائد کر کے فتنوں کا سدباب کریں۔

حواشی

۱۔ دیکھیے امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، از مولانا مناظر احسن گیلانی، مطبوعہ کراچی، ص ۲۴۱-
۲۵۷، نیز خلافت و ملوکیت از مولانا مودودی۔

۲۔ مثلاً سورۂ توبہ: ۷۱، ۱۱۲، سورۂ حج، قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں یہ مضمون بے شمار
مقامات پہ آیا ہے۔ ابن تیمیہ، ابن الاخوہ، ماوردی، ابویعلی، شیرزی اور حسبہ پر لکھنے والے
دوسرے مؤلفین نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تفصیلی بحثیں کی ہیں۔

۳۔ مثلاً قرآن مجید سورۂ عصر، آیت ۳

۴۔ مثلاً سورۂ مائدہ، آیات ۷۸-۷۹

۵۔ إن أحسنت فأعينوني وإن أسأت فقوموني، بحوالہ سیرت ابن ہشام جلد چہارم،
ص ۱۰۷۵، البدایہ والنہایہ، حافظ ابن کثیر دمشقی، جلد ۶ ص ۳۰۱ بعض روایات میں یہ الفاظ
ذرا مختلف بھی ہیں، لیکن مفہوم یہی ہے۔

۶۔ بحوالہ شرح المقاصد، تفتازانی، جلد دوم، ص ۲۷۲

۷۔ بحوالہ فتح القدیر للشوکانی، جلد اول، ص ۳۶۰ (بذیل آیت آل عمران: وشاورھم فی الامر

۸۔ مولانا امین احسن اصلاحی: اسلامی ریاست، صفحہ ۴۸

۹۔ سورۂ حج آیت ۴۱: الذین ان مکناھم فی الارض ------

۱۰۔ البدایہ والنہایہ، حافظ ابن کثیر، جلد ہفتم، ص ۱۲۶